۱۳۳۲ھ نبوی

خونِ شہادت کے دو قطرے

۱۳ ... ۱۹

یعنی

منصور(۱) و سرمد(۲)

کے پرسوز اور دلگداز صحیح اور مستند حالات

مؤلفہ

(۱) ملا محمد الواحدی اڈیٹر نظام المشائخ دہلی

(۲) علامہ ابو الکلام آزاد اڈیٹر الہلال کلکتہ

کتاب ہذا کو فقیر حمید الرحمن عرفی غفرلہٗ نے ملا محمد الواحدی صاحب کے

درویش پریس دہلی میں چھپوا کے

۱۱۲۴

دفتر نظام المشائخ دہلی سے شائع کیا

قیمت مع محصول ڈاک ... [illegible]

خونِ شہادت کے دو قطرے

(۱)

منصور الشہید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شورِ منصور از کجا و دارِ منصور از کجا
خود زدی بانگ انا الحق بر سرِ دار آمدی

یہ کچھ ایران و عربستان ہی میں نہیں بلکہ اکثر ملکوں کا قاعدہ ہے کہ بیٹے کے نام کے ساتھ باپ کا نام بھی ضرور لیا جاتا ہے لیکن ہاں ان حضرت حسین بن منصورؒ میں یہ ایک خاص اور دلچسپ بات تھی کہ انھوں نے اپنے نام کو اپنے باپ کے نام میں فنا کر دیا۔ اور منصور ہی منصور رہ گئے نہ حسین نہ حسین ابن منصور صرف منصور۔ یہ فنائیت کی پہلی منزل تھی جو قدرت نے خود بخود اس مقبول بارگاہ سے طے کروائی۔ وہ منصور جن کے یہ منصور ایک جزو تھے (یعنی ہمارے منصور کے والد) ایک نو مسلم شخص تھے جو ایران کے ایک گاؤں بیضہ نامی میں رہتے تھے۔ وہیں اسی گاؤں میں یہ حضرت پیدا ہوئے۔ لیکن

شاید انکی پیدائش کے بعد ان کے والدین کا زیادہ دن وہاں رہنا نہیں ہوا کیونکہ علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ انہوں نے ہوش عراق میں سنبھالا اس کے بعد انکی تعلیم و تربیت شروع ہوئی۔ اس نے ان سے عراق بھی چھڑوا دیا اور یہ شہر شوستر میں آکر سہیل بن عبداللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے شاگرد ہوئے اٹھارہ برس کی عمر تک انکی خدمت میں رہے۔ اور علوم ظاہری کی تحصیل کر کرا کے عراق عرب کی طرف چلے گئے۔ وہاں اس زمانے میں تصوف نے اپنا نیا رنگ دکھانا شروع کیا تھا اور اس فلسفہ الٰہیہ نے فلسفہ مشائیہ کو بالکل بے حقیقت کر دیا تھا۔ بڑے بڑے عالم اسے چھوڑ کر اسکے والہ و شیدا بن رہے تھے یہ بھی متوجہ ہوئے اور اسی کے گرویدہ ہو گئے اور

صوفیوں کی صحبت

اختیار کی۔ ابوالحسین نوری جنید بغدادیؒ جیسے خدارسیدہ اور باثر بزرگوں میں مل کر بیٹھنے کا چسکہ پڑ گیا۔ بصرہ گئے اور عمر بن عثمان مکی کی خدمت میں رہنے لگے یہاں سے

دوسرا رنگ

چڑھنا شروع ہوا۔ عمر بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے زبردست پایہ کے بزرگ تھے انہوں نے علم تصوف میں کئی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں تھیں لیکن وہ ان کتابوں کو اپنے سے جدا نہونے دیتے تھے۔ اور نہ ہر کس و ناکس کو انہیں دکھاتے تھے۔ ان حضرت کے کہیں وہ ہاتھ لگ گئیں۔ اول تو آپ نے انہیں پڑھا اور پھر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ جن باتوں کو تمام صوفی عوام کے آگے کہنا خلاف مصلحت سمجھتے تھے یہ انہیں سر بازار کھڑے ہو ہو کر لوگوں کو سنانے لگے ظاہر ہیں اور اسرار باطنی سے بیخبر لوگ بھلا ان باتوں کو کہاں سمجھ سکتے تھے۔ اور کب انکی تاب لا سکتے تھے ... کے دشمن ہو گئے۔ اور جب انہیں

معلوم ہوا کہ یہ سب حضرت عمر بن عثمانؒ کی تعلیم کا نتیجہ ہے تو انہیں ان سے بھی نفرت ہو گئی اور چاروں طرف سے اُن کی مخالفت ہونے لگی حضرت عمر بن عثمانؒ کو منصور کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری اور وہ ان سے ایسے کبیدہ خاطر اور بیزار ہوئے کہ انہیں اپنے سے علیحدہ کر دیا اور یہ ان کے فیض سے محروم ہو کر بصرے سے بغداد پہنچے اور دوبارہ حضرت جنیدؒ کی صحبت میں شریک ہو گئے لیکن یہاں بھی وہی باتیں جاری رہیں۔ ایک دن حضرت جنیدؒ سے کچھ سوال پوچھے۔ آپ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ وہ دن بہت قریب ہے کہ ایک لکڑی کا سر تیرے خون سے لال ہوگا۔ منصور کو بھی اس پر جوش آگیا حضرت جنید سے کہا ہاں۔ بیشک میرے خون سے تو لکڑی رنگین ہو گی لیکن آپ کو بھی اس سے پہلے لباس تبدیل کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا دونوں کے قول پورے ہوئے جس کی کیفیت آگے آئے گی۔ مختصر یہ کہ اس سوال و جواب کے بعد آپ نے بغداد کو بھی خیرباد کہا اور شوستر جا پہنچے۔ وہاں طبیعت میں کچھ ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ وہ تمام باتیں جاتی رہیں اور محض عالمانہ شان سے زندگی بسر کرنی شروع کی لوگوں پر بڑا اثر جم گیا سب وقعت اور عزت کرنے لگے لیکن اس حالت میں تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ پھر طبیعت بدلی اور سب چھوڑ چھاڑ سیاحی کرنے لگے دور دور گئے۔ اور سفر میں بھی تحریر و تقریر پند و نصائح سے خلق اللہ کو فائدہ ہی پہنچاتے رہے جہاں گئے لوگوں کو نیک راہ بتائی آخر خراسان ماوراء النہر سیستان۔ فارس کرمان بصرہ وغیرہ دیکھتے دکھاتے مکہ معظمہ حاضر ہوئے۔ اس سفر میں انکے ساتھ چار سو صرف مشائخ تھے دیگر معتقدین کی تو کیا گنتی ہو سکتی ہے لیکن جب آپ حج سے فارغ ہوئے تو ان سب کو رخصت کر دیا۔ اور خود وہیں ٹھہر گئے اور سخت سخت

ریاضتیں

کرنی شروع کیں۔ حضرت منصور ہمیشہ سے بڑے عابد۔ زاہد شخص تھے۔ ایک معمولی

اُن کی یہ بھی کہ دن رات میں چار سو رکعتیں نماز کی پڑھتے تھے لیکن یہاں رہ کر جیسی جیسی سختیاں انہوں نے جھیلیں و محنتیں گوارا کیں انکو سنکر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں پورے ایک سال تک ننگے پنڈے کعبہ کے سامنے کھڑے رہے۔ کپکپاتے ہوئے جاڑے۔ اور عرب کی پگھلانے والی دہوپیں سر پر لیں۔ یہاں تک کہ کھال چٹخنے لگی اور چربی پگھل پگھل کر بہنے لگی ۲۴ گھنٹے کے عرصہ میں صرف ایک روٹی کہانے کو انہیں غیب سے ملجاتی تھی۔ اس سے وہ اپنا دن رات کا روزہ افطار کرتے تھے۔ جب سال تمام ہوا تو دوسرا حج کیا اور پھر سیر و سیاحت کو چلدیئے۔ اب کے ہندوستان اور چین تک آئے اور چین میں تبلیغ اسلام کرتے رہے چین سے پھر بغداد۔ بصرے ہوتے ہوئے مکے واپس آئے اور دو سال قیام کیا۔ بس اب کے وہ

رنگ پختہ ہوگیا

جس میں وہ عرصہ سے غوطے لگا رہے تھے ایک استغراق اور محویت کی حالت طاری ہوگئی مست و از خود رفتہ رہنے لگے۔ عوام تو عوام اس عالم کی باتیں اُنکی خواص کی سمجھ میں بھی نہ آتی تہیں سب نفرت کرنے لگے جدہر جاتے ادہر سے دور دور ا کی آوازیں آتیں لکہا ہے کہ اس حال میں پچاس شہروں میں گئے اور کسی شہر میں رہنا نہ ملا سب جگہ سے نکالے گئے آخر پھر بغداد آئے اور وہیں مقام کر دیا۔

حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے جا کر ملے اور کہا کہ ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ میری نظر سے کل موجودات غائب ہے۔ خود میں ایک بے تھاہ سمندر میں بھٹکتا پھر رہا ہوں حق یگانگی کا اظہار کرتا ہے اور منصور کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

حضرت شبلی نے سمجھایا اور نصیحت کی کہ دوست کے راز کو چھپانا چاہیئے۔ آپ پر اس بات کا بہت اثر ہوا اور بڑی کوشش سے اسرار کو چھپانے لگے لیکن یہ کہاں ممکن تھا بہتیرا ضبط کیا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دم

انا الحق کا نعرہ

شروع ہو گیا جس نے عوام اور خواص سب کو حیرت میں ڈالدیا علمانے کہا کہ یہ کفر کے کلمے ہیں صوفیہ نے بھی انکی ہمنوائی کی۔ لیکن وہ جوش وحدت میں آپے سے نکل چکے تھے سوائے حق کے انہیں کچھ سجھائی ہی نہ دیتا تھا۔ یہ باتیں مطلق کارگر نہ ہوئیں بلکہ روز بروز کیفیت بڑھتی گئی۔ ایک دن یہ قطعہ کہا ؎

اِنّ مَنْ اَھْوٰی وَمَنْ اَھْوٰی اَنَا — نَحْنُ رُوْحَیْنِ حَلَلْنَا بَدَنَا
فَاِذَا اَبْصَرْتَنِیْ اَبْصَرْتَہٗ — وَاِذَا اَبْصَرْتَہٗ اَبْصَرْتَنَا

(ترجمہ) میں وہی ہوں جسے میں چاہتا ہوں۔ اور جس کو میں چاہتا ہوں وہ میں ہی ہوں ہم دونوں دو روحیں ہیں جنہوں نے ایک قالب میں حلول کیا ہے اسی لیے جب وہ مجھے دیکھتا ہے میں اُسے دیکھتا ہوں اور جب میں اُسے دیکھتا ہوں وہ مجھے دیکھتا ہے اب لوگ اور برہم ہوئے اور علمائے ظاہر سے جا جا کر شکایت کرنے لگے کہ انہیں سزا کیوں نہیں دیجاتی۔ علما نے صوفیہ سے صلاح و مشورے کرنے شروع کیے اور آخر

فتوائے کفر

منصور پر لگ گیا۔ صوفیہ سب رمزوں کو سمجھتے تھے اور حال منصور سے خوب واقف تھے لیکن شریعت کو بھی نہ چھوڑ سکتے تھے وہ خاموش رہے انہوں نے نہ ادہر کی کہی نہ ادہر کی۔ لوگوں نے انکی خاموشی کو نیم رضا پر محمول کرکے منصور کو پکا کافر مان لیا۔ لیکن منصور کیا کافر بننے سے ڈرتے تھے۔ ان کا قول تھا اے متحیروں کے رہنما! اگر میں کافر ہوں تو میرے کفر کو بڑھا۔ انہوں نے ان فتوؤں کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اور پروا کیا کرتے۔ انہیں خبر ہی نہ تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسیطرح حق حق انا الحق کہتے رہے یہاں تک کہ کفر کے فتوے سے قید اور قید سے

فتوائے قتل

کی نوبت آگئی ؎

زاہد گمراہ کے میں کسطرح گمراہ ہوں وہ کہے اللہ ہو اور میں کہوں اللہ ہوں

مخالفین نے کوشش کی کہ کسی طرح منصور دار پر پہنچ جائیں علامہ ابوالعباس جو ایک بڑے زبردست فاضل گزرے ہیں۔ اس زمانے میں مفتی تھے ان سے جا کر پوچھا کہ آپ منصور کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ انہوں نے کچھ جواب نہ دیا اور بالکل خاموش رہے اصرار کیا گیا تو یہ کہا کہ اس شخص کا حال مجھ سے پوشیدہ ہے میں اس کی نسبت کچھ رائے نہیں لگا سکتا جب یہاں سے مایوسی ہوئی تو خلیفہ مقتدر باللہ کے وزیر حامد بن عباس سے براہ راست جا کر کہا اور مذہب کے ساتھ پولٹیکل (ملکی) رنگ بھی دیدیا۔ کہا یہ شخص اپنے تئیں زمین کا مالک بتاتا ہے اور بہت سے لوگ اسکے ساتھ ہو گئے ہیں۔ جس سے سلطنت کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس دعوی کے ثبوت میں کچھ جھوٹے سچے گواہ بھی پیش کر دیے اور وزیر کو ایسا بھرا کہ وہ بھی منصور کے درپے ہو گیا اور علماء سے اُنکے قتل کے فتوے طلب کرنے لگا اول اول تو بات کچھ ٹلتی نظر آئی۔ اور علما یکایک قتل کا فتوی دینے پر تیار نہوئے لیکن مخالفت کی آگ بڑی ہوتی ہے جنہوں نے منصور کا پیچھا پکڑ لیا تھا۔ وہ فکر میں رہے اور ڈھونڈ بھال کر کے آخر منصور کی ایک ایسی تصنیف نکال لائے جسمیں کچھ باتیں خلاف شریعت لکھی ہیں۔ کیونکہ علما نے کہا تھا کہ جب تک منصور کی کوئی تحریر خلاف شریعت نہ دکھاؤ گے۔ انکے قتل کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔ اب حامد وزیر نے علما کو جمع کر کے وہ کتاب ان کے سامنے پیش کی اور منصور سے بلوا کر پوچھا کہ یہ عبارت خلاف شریعت تم نے کیوں لکھی ہے؟ منصور نے جواب دیا کہ یہ عبارت میری اپنی نہیں ہے۔ میں نے فلاں کتاب سے نقل کیا ہے۔ اسپر کہیں قاضی عمر کی کی زبان سے نکل گیا کہ او کشتنی

میں نے تو وہ کتاب اول سے آخر تک پڑھی ہے میں نے اس میں یہ عبارت نہیں دیکھی بس کافی بہانہ مل گیا۔ وزیر نے فوراً کہا کہ فتوائے قتل ہو گیا۔ قاضی صاحب نے منصور کو گستاخی کہدیا اب قاضی صاحب! آپ فتوائے لکہدیجئے کہ منصور کا خون مباح ہے۔ قاضی صاحب نے بہتیرا چاہا کہ بات ٹل جائے مگر وزیر منصور کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا اسلیے انہیں مجبور کیا اور قاضی صاحب نے اس کی ناراضگی کا خیال کر کے فتوائے لکہدیا۔ جسپر تمام حاضر علما نے دستخط کر دیئے وزیر نے فوراً منصور کو تو قید خانے بہجدیا۔ اور قتل کی اجازت کے لیے کل روئداد خلیفہ کے سامنے پیش کر دی۔

لیکن خلیفہ نے کہا کہ شیخ جنیدؒ (بغدادی) جب تک منصور کو واجب القتل نہ لکھ دیں گے میں کوئی حکم صادر نہیں کروں گا۔ وزیر نے حضرت جنیدؒ سے عرض کیا! اول اول تو انھوں نے بہی اس معاملہ میں پڑنا مناسب نہ جانا لیکن آخر کار انہوں نے بہی صوفیانہ لباس اتار کر عالمانہ لباس پہنا اور لکہدیا کہ "ظاہر کے لحاظ سے فتوائے قتل دیا جاتا ہے لیکن باطن کا حال اللہ ہی خوب جانتا ہے" لوگ کہتے ہیں کہ یہ منصور کی وہ پیشگوئی پوری ہوئی جو انہوں نے اپنی اس حالت کے شروع شروع میں کی تہی کہ میرے خون سے تو لکڑی لال ہو گی۔ مگر تم کو بہی اسوقت لباس تبدیل کرنا پڑیگا لیکن بعض کے نزدیک یہ واقعہ کا واقعہ ہی غلط اور بے بنیاد ہے جس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ کا اس سولی کے واقعہ سے پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

بہرحال خلیفہ نے سال بھر تک حکم قتل کو معرض التوا میں ڈالے رکھا اور یہ پورا سال منصور کو قید خانے میں کاٹنا پڑا ۔

وہ رند تھے کہ انہیں ہتکڑی کی بیعت تھی ملا تھا گیسوئے جاناں سے سلسلہ لکا

اسیری کے زمانہ میں ایک دفعہ ابن عطا نے انہیں کسی کی زبانی کہلا بہیجا کہ بہائی! اپنے کہے کی معافی مانگ لو رہا ہو جاؤ گے۔ آپنے جواب دیا کہ معافی مانگنے والا ہی موجود نہیں ہے

جو معافی مانگے۔

قید خانے میں انسے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئیں جن میں سب سے آخری کرامت یہ تھی کہ ایک دفعہ آپ نے قید خانے میں جتنے قیدی تھے سب کو آزاد کر دیا۔ قید خانے کی دیوار کی طرف انگلی سے اشارہ کیا وہ شق ہو گئی اور سب قیدی باہر چلے گئے ایک قیدی نے عرض کیا کہ آپ اندر کیوں رُکے کھڑے ہیں۔ آپ بھی نکل آیئے فرمایا تم خلیفہ کے قیدی ہو اور ہم اللہ کے قیدی ہیں ہم آزاد ہو سکتے ہو ہیں نہیں ہو سکتا بیان کیا جاتا ہے کہ اس واقعہ کی اطلاع یابی پر خلیفہ نے آپ کی سولی کا حکم دیدیا

غرضیکہ کوئی بات ہوئی ہو مختصر یہ ہے کہ پورے ایک برس تک قید رہنے کے بعد بتاریخ ۲۴ ذیقعدہ ۳۰۹ھ منصور کو قتل گاہ میں لایا گیا اور مخالفین کی تمنائیں پوری ہوئیں لکھا ہے کہ جس دن اُنکو سولی دی گئی ہے بغداد میں اطراف و جوانب سے اتنی خلقت جمع ہو گئی تھی کہ قیاس سے اسکا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وزیر نے جلاد کو حکم دیا تھا کہ پہلے آپ کے ایک ہزار کوڑے مارے اگر اس سے دم نکل جائے تو خیر ورنہ اور ہزار کوڑے لگائے اور اگر اس پر بھی دم نہ نکلے تو پھر سولی دیدے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ عاشق خدا نے پورے دو ہزار کوڑے کھائے اور اُف تک نہ کی اور آخر کار گردن کٹوا کر جان دیدی۔

زاہد بخیال خویش مستم داند کافر بگمان خدا پرستم داند
مردم تو غلط فہمے مردم مردم اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم داند

قتل کے حالات

یہ ہیں کہ جب انہیں مقتل کی طرف لیچلے تو نہایت وزنی ہتکڑیاں انہیں پہنا دیں لیکن ان پر ان ہتکڑیوں کا کچھہ بوجھ نہ معلوم ہوتا تھا بالکل آرام کے ساتھ چل رہے تھے جب

قتلگاہ میں پہنچے تو خلقت پر نظر ڈالی اور نعرہ لگایا حق حق انا الحق۔ اسوقت ایک فقیر آگے بڑھا اور اس نے آپ سے سوال کیا کہ عشق کسے کہتے ہیں جواب دیا کہ آج کل اور پرسوں میں دیکھ لوگے۔ یعنی آج عاشق کو سولی دیجائے گی۔ کل اُسے جلایا جائے گا پرسوں اس کی خاک اُڑائی جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب منصور کو سولی پر چڑھایا گیا تو انہوں نے اپنے ایک مرید کو

نصیحت

کی کہ اپنے نفس کو عبادت اور ریاضت کے بوجھ میں دبائے رکھ تاکہ بُرے کاموں کی حرکت تیرا میلان نہ ہو جیسے سے فرمایا کہ حق کی یاد کیے بغیر ایک سانس لینا دعوید ار عبادت پر حرام ہے۔

قتل کے بعد

بیان کیا گیا ہے کہ جب انکے جسم سے خون کے قطرے ٹپکتے تھے تو زمین پر ہر ہر قطرے سے انا الحق کا نقش بنجاتا تھا۔ جب انکی خاک دریا میں ڈالی گئی تو پانی پر بھی وہی کیفیت ہوئی جلانے سے پہلے انکے ایک ایک رونگٹے سے انا الحق کی صدا آتی تھی جب خاک ہو گئے تو اسمیں سے بھی وہی آواز آتی رہی۔ دریا میں جب اُنکی خاک کو ڈالا گیا تو اسمیں ایسا سخت طوفان آیا کہ شہر کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہوگیا۔ بڑی مشکل سے وہ طغیانی رفع ہوئی منصور کی نسبت

عوام وخواص کے خیالات

نہایت عجیب اور دلچسپ ہیں جنسے ظاہر ہوتا ہے کہ خواہ کوئی کیسے سے کیسا دنیا اور دنیا کے لوگوں سے بے تعلق شخص کیوں نہو دنیا والے اُسے برا بھلا کہے بغیر نہیں مانتے۔ منصور کے زمانہ کے عوام نے تو خیر انہیں کافر۔ مرتد۔ مردود سب کچھ بنایا ہی تھا۔ لیکن اسوقت کے بعض بعض مشائخ اور علمائے تصوف بھی اُنکے کمالات کے منکر تھے۔ تاہم بڑے بڑے کاملین اور صوفیائے

علماء نے انکی تعریفیں ہی کی ہیں۔ اور انہیں ایک نہایت مقدس بزرگ مانا ہے۔ حضرت شیخ شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "میں نے ایک دفعہ منصورؒ کو خواب میں دیکھا اور اُن سے پوچھا کہ کہو اللہ پاک سے آپؒ کی کیا گزری۔ جواب دیا کہ مجھے مقام صدق میں اُتارا اور میری بڑی عزت و توقیر فرمائی۔ میں نے دریافت کیا کہ تمہارے موافق و مخالف گروہوں کی نسبت کیا رہا۔ کہا دونوں گروہوں پر رحمت نازل کی۔ کیونکہ دونوں معذور تھے۔ جس گروہ نے مجھے پہچان لیا تھا وہ میری موافقت پر مجبور تھا اور جس نے مجھے پہچانا نہیں تھا اسکو شریعت کے موافق عملدرآمد کرنا لازمی تھا"

ایک اور بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ حشر برپا ہے اور منصور سر بغیر ایک ہاتھ میں جام لیے کھڑے ہیں۔ بزرگ نے پوچھا کیا حال ہے؟ کہا سرکٹوں کو شراب وحدت کا جام پلا رہا ہوں"

شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "منصور بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے وہ اپنے زمانہ میں فرد تھے"

خواجہ فرید الدین عطارؒ فرماتے ہیں کہ "منصور بڑے پارسا اور متقی شخص تھے۔ ان کا سارا وقت عبادت و ریاضت ہی میں گزرتا تھا۔ پیروی سنت اور ادائے فرض میں ہرگز غفلت نہ کرتے تھے۔ وادی معرفت کے پورے سالک تھے۔ جذبے اور از خود رفتگی کی حالت میں ان سے ایک بات خلاف طریقہ صوفیہ نکل گئی۔ اس سے اُنپر کفر کبھی عائد نہیں ہوسکتا جس کے دماغ میں تھوڑی سی بھی بوئے توحید پہنچ چکی ہے۔ اسے اُنکے حلولی ہونے کا خیال نہیں آسکتا۔ جو انہیں برا کہتا ہے وہ اسرار توحید سے بالکل بےخبر ہے"

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز کے سامنے خواجہ منصور کا ذکر آیا۔ آپ بہت دیر تک انکی بزرگی کی تعریف کرتے رہے اور فرمانے لگے کہ جب منصور سولی کے پاس پہنچے۔ شیخ شبلی رحمۃ

اُن سے پوچھا کہ عشق میں صبر کیا ہے۔ منصور نے جواب دیا کہ محبوب کی خاطر ہاتھ اور پاؤں کٹوا دیوے اور سولی پر چڑھ جائے اور دم نہ مارے۔ یہ کہکر حضرت محبوب الٰہی چشم پر آب ہو گئے اور فرمایا کہ بڑے صادق عاشق تھے۔

اصل یہ ہے کہ منصور جو یہ تھوڑے بہت بدنام ہو گئے وہ کچھ تو مخالفت کی وجہ سے ہوئے اور کچھ اُنکے اپنے معتقدوں اور مریدوں نے بھی ان پر دھبے لگوائے۔ ان مریدوں نے اُنکے قتل کے بعد وضع وضع کے خیالات ظاہر کرنے شروع کیے اور مبالغہ کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے اُسکے بعد اُنکے معتقدوں میں ایک گروہ پیدا ہو گیا جو زندیق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ اکثر باتیں خلاف اسلام کرتا تھا۔ حلول اور اتحاد کے متعلق اسکے بڑے غلط خیالات تھے۔ حضرت منصور کی خواہ مخواہ تقلید کرتا تھا اور مرنے اور جل جانے کو فخر سمجھتا تھا۔ لوگ ان باتوں کا بھی انکو ہی الزام دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ان لوگوں میں سب منصور ہی کی تعلیم و تلقین کا اثر ہے اب اس مضمون کو

منصور کے چند اقوال

پر ختم کیا جاتا ہے۔ منصور ایک بڑے فاضل شخص تھے۔ شریعت طریقت اسرار و معارف ان مضامین میں انہوں نے بڑی بڑی دقیق کتابیں لکھی ہیں۔ شاعر بھی اعلےٰ پایہ کے تھے نہایت فصیح نہایت بلیغ لیاقت و فراست ان کے اقوال سے ظاہر ہوتی ہے فرماتے ہیں "ترکِ دنیا نفس کا زہد ہے اور ترکِ آخرت دل کا زہد۔ خدا اور بندے کے درمیان صرف دو قدم کا فاصلہ ہے ایک قدم دنیا سے اُٹھاؤ اور دوسرا عقبےٰ سے۔ اپنے مولےٰ کو پا لوگے" صوفی کی تعریف کرتے ہیں کہ "وہ واحد فی الذات ہوتا ہے نہ وہ کسی کو جانتا ہے اور نہ کوئی اور اُسے پہچانتا ہے" فرماتے ہیں "اہل بصیرت ایک ہی نظر میں مقصود کو پا لیتے ہیں اور پھر انہیں کوئی دگدا نہیں رہتی" انبیا علیہم السلام تو حال پر غالب ہوتے تھے۔ اسواسطے حال اُنکی حالت کو بدل نہیں سکتا تھا مگر انبیاء کے سوا سب پر حال کا غلبہ ہوتا ہے اور حال سے اُنکی حالت بدلجاتی ہے

بہ نفد [illegible] اور حقیقت حیات جان۔   محمد الواحدی

(۲)

سرمد شہید

سرمد کی شہادت اگرچہ ہر خاص و عام میں مشہور ہے مگر اسکے واقعات اردو زبان میں آجتک قلم بند نہیں ہوئے تھے مولانا ابو الکلام محی الدین آزاد دہلوی قادری نقشبندی (چیف اڈیٹر الہلال کلکتہ) شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت اور کمی کو پورا کیا اور خوب پورا کیا بقول سیدی خواجہ حسن نظامی باعتبار ظاہر اردو زبان میں اس سے اعلیٰ اور شاندار الفاظ آجکل کوئی جمع نہیں کر سکتا اور با اعتبار معانی یہ سرمد کی زندگی و موت کی بحث نہیں معلوم ہوتی بلکہ مقامات درویشی پر ایک مستانہ اور البیلا خطبہ نظر آتا ہے۔ حضرت آزاد مسلمانوں کے اس دور آخر میں اگلے وقت کی ذہانت و ذکاوت کا مجسم ظہور ہیں۔ اگر مسلمانوں کی قدردان حکومتیں باقی ہوتیں تو ہم جیسے بے نوا لوگ آزاد تک کہاں پہنچ سکتے کیونکہ انکے گرد تاجداروں کا حلقہ ہوتا۔ آپ ایک مشہور صوفی بزرگ مولوی خیر الدین صاحب کے صاحبزادے ہیں جنکے اضلاع بمبئی و بنگال میں ہزارہا مرید پائے جاتے ہیں عربی۔ فارسی اردو تینوں زبانوں پر انکو یکساں قابو حاصل ہے۔ تحریر کا نمونہ تو ناظرین کے سامنے ہے۔ تقریر اس سے بڑھکر دل آویز اور جادو خیز ہوتی ہے (مرتب)

آنانکہ غم تو برگزیدند ہمہ — در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکۂ دو کون فتح از عشق ست — باآنکہ سپاہ او شہیدند ہمہ

عہد عالمگیری اور اسکے بعد جسقدر فارسی تذکرے لکھے گئے۔ ان میں بالعموم سرمد کے عنوان سے ہی چند سطریں ملتی ہیں۔ لیکن اول تو قدیم تذکروں کے حالات

اسقدر مختصر اور ناکافی ہوتے ہیں کہ اگر زندگی میں اُنکے نام خطوط لکھے جاتے تو لفافے کے لیے پورا پتہ بھی میسر نہ آتا میں نے عہد عالمگیری کی تاریخوں کو دیکھا کہ شاید حوادث واقعات کے ضمن میں کچھ حالات ملجائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پولیٹیکل عاقبت اندیشیوں نے قلم کو روک لیا تھا مرزا محمد کاظم نے عالمگیر کے حکم سے تمام سوانح وحالات بقید سنین قلبند کرنے شروع کیے لیکن صرف دس سال ہی کے حالات لکھے تے کہ حکماً یہ سلسلہ بند کردیا گیا۔ اسکے بعد شاہ عالم کے عہد میں نواب عنایت اللہ کو خیال تکمیل ہوا۔ اسکے اشارے سے مستعد خاں نے بقیہ چالیس سال کے سوانح قلبند کیے اور ابتدائی دو سالہ مجموعے کا انتخاب شامل کرکے مآثر عالمگیری نام رکھا۔ میں نے سنہ ہجری کے حالات کی ورق گردانی کی کہ یہی سرمد کی شہادت کا سنہ ہے مگر حالات کا ملنا ایک طرف معلوم ہوتا ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ تاریخ کے صفحوں کو بچایا گیا ہے کہ اس شہید عشق کے جامۂ خونچکاں کی قطرہ افشانی سے حاشیے پر کہیں دھبے نہ پڑجائیں۔ لطف یہ کہ اسی سال سے شاہ عباس ثانی اور حسین پاشاہ رومی (غالبًا والی حجاز) کے سفرا آئے تھے۔ اُنکے حالات کی سطریں صفحے کی انتہا تک ہی پہنچکر آگے بڑھنے سے نہیں رکتیں۔ خیر یہ حالات بھی کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے تھے۔ طرہ بریں یہ کہ اس سال نواح دہلی میں کہیں چند لڑکے شاہ و وزیر کی نقل کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک کوتوال اور ایک مجرم بھی تھا۔ مصنوعی کوتوال نے غیظ و غضب میں آکر مصنوعی مجرم کو اصلی سزا دیدی۔

نصف صفحے کے قریب اس حادثۂ عظیم اور داستان اہم کی نذر کیا گیا مورخ کی نظر کا جب یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے قصوں کے

ہجوم میں سرمد بیچارے کی نعش کیونکر نظر آتی۔
خافی خاں کی منتخب اللباب عہد مغلیہ کی مشہور ترین تاریخ ہے جس نے اورنگ زیب کے حالات اس تفصیل سے لکھے ہیں گویا صرف یہی زمانہ موضوع کتاب ہے۔ قیاس کہتا تھا کہ اس نے یہ واقعہ نظرانداز نہ کیا ہوگا۔ کیونکہ عالمگیری عہد کا قلم اسکے ہاتھ میں نہ تھا۔ جسکو ہر قدم پر روک لیے جانیکا اندیشہ ہو مگر جب اسے کھولا تو ہزار صفحے کی سوانح میں ایک لفظ بھی سرمد کی نسبت نہ تھا سچ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا راز مورخ کا قلم ہے آج کون کہہ سکتا ہے کہ اسکی باگ میں کتنی گرہیں ڈالدی گئیں ہیں۔
سرمد کی شہادت کا وہی سن ہے۔ جس سن میں کوچ بہار اور آسام پر چڑھائی کیگئی۔ اس لیے دونوں تاریخوں نے اس سال کے حالات کا نصف حصہ اسی فتحیابی کی داستان سرائی میں صرف کردیا۔ فتح آسام کی اہمیت بیان میں شک نہیں مگر مستعد خاں کو کیا معلوم تھا کہ تماشاگاہ عالم میں ایسی آنکھیں بھی ہیں جو اس شاہجہانی فتح پر توغلط انداز نظر بھی نہ ڈالیں گی مگر اس غم اثر شکست پر ہمیشہ خونچکاں رہیں گی جو ایک مجنون لیلائے حقیقت کو دار پر کھینچکر معرکہ حق پرستی میں عالمگیر کو نصیب ہوئی۔
قصہ مختصر بایں ہمہ دو کتابیں ایسی پیش نظر ہیں جنسے زیادہ معتبر راوی سرمد کے لیے نہیں ہوسکتے پہلا شخص شیر خاں لودی ہے جو بغیر کسی واسطے کے عالمگیری عہد کے واقعات لکھتا ہے کیونکہ اسی عہد کا تذکرہ نویس ہے اس کا تذکرہ مرأۃ الخیال میرے سامنے ہے دوسرا شخص علی قلیخاں داغستانی عہد محمد شاہ کے امراءمیں سے ہے جسنے نہایت تفحص و احتیاط سے شعرائے فارسی کا تذکرہ ریاض الشعراء مرتب کیا اس کا قلمی نسخہ مصنف ایشیاٹک

سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے اور زیادہ تر حالات میں نے اسی سے لیے ہیں۔ یہ گو عہد محمد شاہ میں لکھ رہا ہے لیکن سرمد کے حالات کے لیے ایک واسطے سے زیادہ دور نہیں اسکے علاوہ عام تذکروں نے جو کچھ لکھا ہے۔ ذہن میں کچھ نہ کچھ محفوظ ہے ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک بیاض قلمی عہد عالمگیر ثانی کے کسی خوش مذاق شاعر سراج الدین سراج کی جمع کی ہوئی ہے اس میں کہیں کہیں حالات بھی دیئے ہیں چند باتیں اُس سے معلوم ہوئیں غرضکہ گلدستہ تو نہ بنا مگر چند پتیوں اور پنکھڑیوں کو دامن میں لے لیا ہے کہ مشہد سرمد پر جاؤں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں۔

ابوالکلام آزاد

سرمد کی اصل قومیت اور مذہب کو کوئی صاف نہیں بتلاتا مصنف مراۃ الخیال کا بیان ہے کہ "اصلش از فرنگستان وارمنی بود" مگر باقی تذکرے یہودی الاصل بتلاتے ہیں والہ داغستانی اس پر اتنا اور بڑھاتا ہے کہ وطن کاشان تھا مگر یہ اختلاف باہم تناقض نہیں کیونکہ ایران میں قدیم سے ارمنیوں کی وسیع آبادی موجود ہے جو بالعموم مسیحی اور بعض بعض یہودی ہیں۔ اب تو انہوں نے یکسر یورپین طرز معاشرت اختیار کرلی ہے۔ اور تحصیل علوم جدیدہ میں تمام ایرانی جماعتوں سے بیشتر ہیں۔ مگر ایک صدی پیشتر تک ان میں مذہب کے سوا کوئی بات مسلمانوں سے مختلف نہ تھی انمیں سے بعض اسلامی علوم و آداب کو اس حد تک حاصل کرتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ صحبتوں میں شریک ہو سکتے تھے چنانچہ تذکروں میں متعدد شعرا کے حالات ملتے ہیں جو ارمنی اور مسیحی تھے مگر انکے اشعار ایران کے مسلمان خوشگو شعرا کے کلام سے کسی طرح کم نہیں سرمد کا خاندان بھی ارمنی او یہودی گا۔ کاشان میں متوطن ہوں گے ارمنی ہونیکی وجہ سے لوگوں کو خیال پیدا ہوا ہوگا کہ فرنگی ہے اور ایک باہر کے غیر معروف

آدمی کی نسبت ایسا ہو کا ہوتا کچھ عجب نہیں۔

آفتاب جب چمکتا ہے تو باغ و چمن کو نہیں ڈھونڈ ہتا کہ اپنی کرنوں کا انہیں نشیمن بناؤں۔ اُسکا فیضان ضو بخش مبدء فیاض کی طرح فیض عام ہے محلسرائے شاہی کے کنگروں کے طلائی کلس اگر اس کی ضوافشانی سے چمک اُٹھتے ہیں تو کیا جنگل کے خشک درختوں کی شاخوں پر سنہری رنگ نہیں چڑھ جاتا؛ میں کیا کہ رہا ہوں! میرا مقصد نظام شمسی کے مرکز سے نہیں بلکہ آفتاب اسلام سے ہے اُس اقیانوس تجلی کی لہریں اُنہیں تو اُنہوں نے پہلے تو جسم و خون اور قوم و مرز بوم کے قائم کئے ہوئے امتیازات کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ پھر سیرابی کا وقت آیا تو احرار قریش اور ارقائے حبش بطحا و یثرب اور عجم و فرنگ، تاجدار غسان اور بادیہ نشین عرب ادنئے و اعلئے دور و نزدیک سب کو یکساں طور پر شریک فیض کیا۔ صرف صلاحیت اور اثر پذیری معیار فیض رسانی تھی کہ ہر قوم اور ہر زمین بقدر صلاحیت حصہ یاب ہوئی ابوجہل قریشی تھا اور خزانے کے پاس مگر مدت العمر محروم رہا بلال حبشی اور سہیل رومی تھا پھر کسقدر دور مگر اُنکے دامن دیکھیے تو مالا مال تھے۔ ابر کرم کہاں نہیں برستا؟ مگر ہر زمین لالہ زار نہیں بنجاتی۔

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہوا تھا

یہ اسی فیاضانہ فیض بخشی کا نتیجہ تھا کہ عرب گو مبدء و منشاء اسلام تھا مگر اُسکی کوئی خصوصیت نہیں رہی۔ نومسلم قومیں جو دور دراز ملکوں سے آئی تھیں ہر علم و فن میں اسطرح دست بر گم ہوئیں کہ خود عرب کو انکے لیے اپنی صفیں توڑ دینی پڑیں۔ یہاں تک کہ آج تراجم رجال کی کتابیں اٹھا کر دیکھتے ہیں تو کوئی علم و فن ایسا نظر نہیں آتا جسپر نومسلم قوموں کا تسلط نہو۔ حتی کہ فقر و تصوف جس کی مذہب کے تلے میں پرورش ہوتی ہے۔ اس کی تاریخ بھی نومسلم اشخاص کی خود فروشیوں کی منت پذیری سے آزاد نہیں۔ بات یہ ہے کہ خدا کی محبت کی طرح اسلام کی بے دریغ فیض بخشی بھی اسطرح عام تھی کہ نسب و قومیت کے

کے امتیازات کو اس میں دخل نہ تھا۔ محرم کی سبیلیں جب لگائی جاتی ہیں تو پیاسوں کی تلاش ہوتی ہے۔ زریں کلاہوں اور ریشمی قباؤں پر نظر نہیں پڑتی۔ سرچشمہ فیضان الٰہی بھی تشنگان محبت کو ڈھونڈھتا ہے۔ نسب و قومیت اور رنگ و خاندان سے اسے کیا سروکار!

اس عام فیض بخشی کی ایک نمایاں نظیر سرمد کی سوانح عمری بھی ہے۔ وہ ایران کے کسی ارمنی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور مذہباً یہودی یا مسیحی تھا۔ آغاز عمر ہی میں فیضان الٰہی کی نظر انتخاب پڑی۔ اور جذب ہدایت کی کشش نے مشرف باسلام کیا۔ خاندانی نام کا پتہ نہیں چلتا۔ اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد کیا نام رکھا گیا۔ عام طور پر صرف سرمد ہی کے لقب سے تذکروں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ سرمد کا بے نام ہونا جائے تعجب نہیں۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی شرع میں بے نام و نشانی تو رکن اولین بلکہ شرط ایمان ہے۔

باوجودت زمن آواز نیاید کہ منم

لیکن بعض تذکروں میں سعید لے سرمد کے عنوان سے اسکے حالات درج کیے گئے ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسلامی نام کا ایک جزو شاید لفظ سعید ہو گا جو بقاعدہ تخفیف تخلص کے ساتھ مشہور ہو گیا

تحصیل علمی کا حال معلوم نہیں لیکن تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ علم و فضل اور عربیت میں درجہ کمال رکھتا تھا اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تحصیل علمی اس زمانے کے نصاب کے مطابق کامل ہو گی۔

ابتدائی پیشہ تجارت تھا۔ ایران سے تجارتی اعمال لیکر ہندوستان کی طرف بڑھا کہ اس زمانے میں علم و فن کی طرح جنس متاع کی بھی نمائش گاہ ہندوستان تھا مگر یہ جوان تاجر جو بے خبر ہندوستان کی طرف قدم زن تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ

وہاں پہنچکر کس تجارت میں اُسے اپنا تمام سرمایہ لگا دینا پڑے گا وہ شاید ایرانی مصنوعات فروخت کر کے ہندوستان کی قیمتی اجناس اور محسود عالم کانوں کے لعل و الماس خریدنا چاہتا تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ قضا و قدر اسکے خلاف فیصلہ کر چکی ہے۔ تجارت تو اسے بہرصورت آخر حیات تک کرنی پڑے گی۔ مگر زخارف مادے کی تجارت گاہوں میں نہیں، بازار حسن و عشق میں جہاں چاندی سونے کی جگہ دل صدپارہ اور جگر صد زخم خوردہ کا سکہ رایج ہے، اور جہاں کی تجارت یہ ہے کہ صبر و شکیب۔ ہوش و خرد دل و جگر دے کر ایک غلط انداز نظر، ایک چین جبین، ایک تغافل پیشہ نگاہ خرید لیجئے کہ اس سہل قیمت پر یہ متاع مشکل مفت ہے +

صد ملک دل بہ نیم نگہ میتواں خرید   خوباں دریں معاملہ تقصیر میکنند

اور صرف اتنا ہی نہیں کیونکہ یہ تو اس بازار کی نمائشی اور سامنے کی چہل پہل ہے اگر ہمت قدم آگے بڑھائے تو پھر وہ آخری سودا بھی کرنا پڑے گا۔ جس کی قیمت نقد جان ہے اور جس میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ حیات کا لبریز پیمانہ خون شہادت کے ایک لبریز جام سے بدل لیا جاتا ہے اور ثمن بخس کے معاوضے میں اگر یوسف ملے تو کون خیرہ نظر ہے جو اس متاع کا مشتری نہو۔

دو عالم نقد جاں بر دست دارند   بیازارے کہ سودائے تو باشد

اس زمانے میں ایرانی سیّاح عموماً سندھ ہو کر ہندوستان آتے تھے۔ سندھ کے شہروں میں ٹھٹھہ ایک مشہور شہر تھا، جسکو اب نئے جغرافیئے میں گمنامی کا خانہ نصیب ہوا ہے، یہی ٹھٹھہ وہ سینائے مقدس تھا جو سرمد کے لیے تجلی گاہ ایمن بنا، اور لیلائے حسن نے اول اول اپنے چہرے سے نقاب الٹی۔ کہتے ہیں کہ ایک ہندو لڑکا تھا جس کی چشم کافر نے یہ افسوں طرازی کی۔ اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ کیونکہ عشق خیز دلوں کو دو نیم کرنے میں بخیہ گر کی سوئی اور جلاد کی تیغ، دونوں برابر ہیں، یہاں

تجارت میں خریدار عموماً بے پروا و بے نیاز مگر صاحب جنس غرضمند ہوتا ہے پھر جو لوگ کہ اپنے دلوں کو ہاتھوں پر بطرز نذر رکھے ہوئے خریدار ڈھونڈتے ہوں۔ انہیں تو حق ہی نہیں کہ خریدار میں خاص اوصاف کے طالب ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادہ لوح ایرانی تاجر بھی متاع دل کی کس مپرسی سے تنگ آگیا تھا اور خود خریدار کو بے تابانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جب خریدار ملگیا تو نظر اٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ کون ہے اور کیا لیکے آیا ہے؟ اسی کو غنیمت سمجھا کہ دل جیسی متاع ارزاں کی ایک چشم سحر کار طالب ہے اور بلا تامل یہ سودا منظور کر لیا ؂

دلال عشق بود خریدار جانستاں ۔۔۔ خود را فروختیم چہ سودا بما رسید

سرمد کو آیندہ جس صحرا میں بادیہ پیمائی کرنی تھی یہ اسکی طرف پہلا قدم تھا اور کچھ سرمد ہی کی خصوصیت نہیں۔ عشق خواہ کسی عنوان ہو منزل حقیقت کا ہمیشہ سے پہلا قدم ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی تنزل ہے۔ منزل حقیقت کا کیا ذکر۔ عشق تو وہ دروازہ ہے جس سے گزرے بغیر انسان انسان نہیں ہو سکتا۔ جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں میں تری نہیں۔ اسکو معنٰی انسانیت سے کیا واسطہ؟ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ زاہد معتکف بھی بایں ہمہ تعبّس و تقشّف جب اپنے زاویہ عبادت میں سر بزانو ہوتا ہے تو حور و غلماں کی مسکراہٹ سے لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتا یعنی جو خشک دماغ مسجد کے گوشوں اور حجروں میں دوست کو ڈھونڈتے ہیں۔ انہیں بھی اس تصور کے بغیر چارہ نہیں ۔ ؂

حور و جنت جلوہ برزاہد دہد در راہ دوست ۔۔۔ اندک اندک عشق درکار آورد بیگانہ را

یہی وجہ ہے کہ جو سود ازدگان حقیقت شاہد ازلی کے جاں دادہ ہیں انہیں بھی عشق مجازی کے کوچوں میں در و دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا گیا ہے کیونکہ دل جب تک لذت آشنائے درد نہو۔ برف کی ایک قاش ہے جسکو پانی بنتے دیکھا ہے مگر آگ میں

بستے ہوئے کبھی نظر نہ آئی۔ حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے اور عشق کا کلیسا آتشکدہ ہے۔ یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنے دلوں کو اس آتشکدے پر نذر چڑھا دیں۔ اور پھر دامن سے ہوا بھی دیتے جائیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے۔ ؎

افسردہ را نصیب نباشد دل کباب
آں یاد ہاد ایں نوالہ کہ مہمانِ آتش است

عشق الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسوا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں مگر انسان آب و گل کے تعلقات میں اس طرح پابگل ہے کہ جب تک دل پر درد کی کوئی محکم چوٹ نہ لگے ادہر سے ٹوٹ نہیں سکتا۔ مکھی جب شہد پر بیٹھ جاتی ہے تو جب تک اُڑائے نہیں نہیں اڑتی۔ انسان کا دل بھی جب تک چوٹ نہ کہائے۔ دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے۔ عشق ہی کا فرشتہ اپنے بازوؤں میں وہ ما فوق الفطرۃ طاقت رکہتا ہے کہ اسکی تیغ کا پہلا ہی وار خون کی تاروں سے بندہے ہوئے رشتوں اور دنیا کی دلفریبیوں کی جکڑی ہوئی زنجیروں کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اور دل جب ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو حلقۂ ازل کے سوا اور کوئی بیڑی پاؤں میں نہیں ہوتی۔ اسی درد کے لیے عارف عطؔار بیقرارانہ فغان ساز ہے کہ۔ ؎

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرۂ دردے دلِ عطؔار را

غور کرو جس مردہ دل کو کبھی یہ وقت خوش نصیب نہوا کہ کسی بند نقاب کے ٹوٹنے کے تصور میں اپنے خرمن و ہوش و حواس پر بجلیاں گرائے اسکو شاہدِ حقیقت کا نظارہ حواس ظاہری سے کب ہو سکتا ہے؟ جس افسردہ نفس نے اپنی عزیز اور شیریں راتیں کسی نرگس خواب آلود کی یاد میں نہ کاٹی ہوں اسکو معشوق حقیقی کی یاد میں بے چین راتیں کب نصیب ہوں؟ جس خیرہ دماغ نے اپنے سرمایہ

عجز و نیاز کو کسی مغرور ناز کی کج اداؤں اور بے نیازیوں پر نثار نہ کر دیا ہو وہ خود پسندی
اور وجود آرائی کے بت کو کیونکر توڑ سکتا ہے؟ جس جس کو کسی پیکرِ حسن کی صدائے
شیریں نے مبہوت اور لایعقل نہ کر دیا ہو اسکو ساز ازلی کی نغمہ سرائی پر کیونکر وجد آئے
غرضیکہ جس بدنصیب کو کسی مستِ حسن کی نگاہ بے محابا نے بیخود نہ کر سکی اُسے جلوۂ طور پر
کیوں غش آنے لگا۔ جو فتیلہ پہلے جل چکا ہو وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے لیکن نئے فتیلے
کو بہت دیر تک آگ دکھلانی پڑتی ہے ؎

محبت با دل غمدیدہ الفت بیشتر گیرد　　چراغے را کہ دودے ہست در سر زود تر گیرد

نظریں اگر جویائے حسن ہیں تو روئے پنہاں کے نظارے کی کیوں منتظر ہیں؟
انہیں تو پردۂ نقاب کی زیبائی پر ہی لوٹ جانا چاہئے کنعان کی گم کردہ پسر
آنکھوں نے جلوۂ یوسفی کا انتظار نہیں کیا۔ پیراہنِ یوسفی کی بو پاتے ہی کھل گئیں
انی لاجد ریح یوسف لولا ان تفندون یہی وجہ ہے کہ میخانۂ حقیقت میں جب مجلس
گرم ہوتی ہے تو پہلے جام و مینا کا دور چلتا ہے اور جب اسکے تلخ گھونٹ گوارا ہو جاتے
ہیں تو پھر خود ساقی اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دیتا ہے کہ اب جام و سبو کی ضرورت نہیں
اسکی نگاہ نشہ خیز سے خود رفتگی و خود گم گشتگی حاصل کیجئے

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشم تا خمار باشد

سرمد کے آگے یہ جام رکھا گیا۔ اور جام کی خوبی بہت کچھ جام پیش کرنے والے ہاتھ کی
رعنائی پر منحصر ہے۔ اسلئے ہم اُس ہندو لڑکے کو بھولنا نہیں چاہتے جس کی نگاہ لیلیٰ
روش نے سرمد کو مجنوں بنایا۔ مگر افسوس کہ ہر عاشق قیس و فرہاد کی قسمت
کہاں سے لائے؟ سرمد کے لیلےٰ کا زیادہ سے زیادہ جو حال معلوم ہوتا ہے یہی ہے
کہ ایک ہندو لڑکا تھا۔ اور غور کیجئے تو یہ بھی بہت ہے۔ کیونکہ بازارِ عشق میں جب
سودا چکایا جاتا ہے تو یہ کب دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے اور کیا قیمت

مل رہی ہے۔؎

مرا فروخت محبت ولے نمیدانم
کہ مشتری چہ کس ست و بہائے ما چند ست

اسباب تذکرہ اسمیں بھی ہم آہنگ نہیں کہ یہ واقعہ کہاں ہوا۔ والہٗ داغستانی لکھتا ہے کہ بندر سورت میں اور آزاد بلگرامی نے اپنے کسی تذکرے میں عظیم آباد پٹنہ لکھا ہے لیکن ان سب میں مراۃ الخیال قدیم العہد ہے اور اس کا بیان ہے کہ در اثنائے تجارت بشہر تتہ افتاد و بر ہندو پسرے عاشق گشت اسلیئے ہمنے اسی کو ترجیح دی ہے۔ بہر کیف بجلی کہیں گری ہو دیکھنا یہ ہے کہ دہقان کے خرمن سوختہ کا کیا حال ہوا۔

عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں ہر عاشق گو قیس نہو مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے اور جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لیئے جگہ خالی کردو سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور جذب جنوں اسطرح چھایا کہ ہوش و حواس کے ساتھ تمام مال و متاع تجارت بھی غارت کردیا دنیوی تعلقات میں سے جسم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی بالاخر اس بوجہ سے بھی پاؤں ہلکا ہوگیا کہ پابندیاں تو مدعیان ہوشیاری کے لیے ہیں۔ مجنوں لایعقل مرفوع القلم ہوتے ہیں۔؎

خطا بردم دیوانہ کس نمیگیرد
جنوں نداری و آشفتہ خطا اینجا ست

بیابان نوردی عالم عشق کی سیر و سیاحت ہے کہ اسی سے انسان کی عقل تجربہ کار و پختہ ہوتی ہے "مجنوں" جو صف عشاق میں نمایاں نظر آتا ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ صحرا گردی میں کوئی اسکا حریف نہیں سرمد نے بھی مدتوں صحرا کی خاک چھانی سندھ کے ریگ زاروں سے تلوے گرم کیے۔ ہندوستان کے گرم سرد موسموں کو یکساں عریانی میں کاٹ دیا اور بالاخر جب یہ عقدہ کھلا کہ؎

بیہودہ چرا در طلبش میگردی؟
بنشیں! اگر او خداست خود می آید

(بقیہ)

تو پھر ایک مستقر کی تلاش ہوئی جہاں بیٹھکر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کیا جائے لیکن جب نتیجہ یہی ہتا تو پھر یہ بیاباں نوردی کیوں تھی؟ مگر نہیں خود کہہ چکا ہوں کہ یہ بھی عشق کے قانون کمال میں داخل ہے اور عشق کے قانون میں استثنا نہیں ؎

یکے از دستگیر بہائے عشق است   عزیزاں را بخواری بر کشیدن

یہ وہ زمانہ تھا کہ عنقریب بساط ہند پر عالمگیرؒ ایک نئی چال چلنے والا تھا اور شاہ جہانیؒ حکومت کا عہد آخری اور شہزادہ داراشکوہؒ ولیعہد سلطنت تھا۔ سلسلہ مغلیہ میں داراشکوہؒ ایک عجیب طبیعت اور دماغ کا شخص گزرا ہے اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیئے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اُسکے دشمن کا قبضہ رہا اس لیے اصلی تصویر پولیٹکل تو گرد و غبار میں چھپ گئی۔ وہ ابتدا سے درویش دوست اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقرا اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی بعض تحریرات جو دست برد حوادث سے بچ گئی ہیں بتلاتی ہیں کہ انکا لکھنے والا خود بھی ذوق کیفیت سے خالی نہیں اس کے صاحب ذوق ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی اور جس نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقرا کے آگے سر جھکاتا تھا۔ ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں کے ساتھ بھی رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اس عالم میں بھی کفر و اسلام کی تمیز ہو تو پھر اعمیٰ اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا؟ پروانہ کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہیئے۔ اگر صرف شمع حرم کی شیدا ہے تو سوز طلبی میں کامل نہیں۔

عاشق ہم از اسلام خرابست و ہم از کفر   پروانہ چراغ حرم و دیر ندا ند

سرمد جوشش جنوں میں پھرتا ہوا جب شاہجہان آباد دہلی پہنچا تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لیے جائیں کیونکہ جس جام کی تلاش ہے وہ اسی میخانہ میں ملے گا۔ مصنف مراۃ الخیال جو عالمگیر پرستی کے معبد میں صف اولین کا

طالب ہے لکھتا ہے کہ "چوں خاطر سلطان دارا شکوہ بجانب مجانین میل داشت صحبت بو سے در گرفت" بیچارا اعلی شیرابی ہوشیاری و دیوانگی کی بحث میں سرمار رہا ہے اُسے کیا خبر کہ دنیا میں ایسے ترازو بھی ہیں جنکے ایک پلڑے میں اگر دیوانگی رکھدی جائے تو دوسرا پلڑا تمام عالم کی ہوشیاری رکھدینے سے بھی نہیں جھک سکتا۔ اور پھر ایسے خریدار بھی ہیں جنکو اگر ہوش و حواس کا تمام سرمایہ دیدینے سے ایک ذرہ جنوں ملسکتا ہو تو بازار یوسف کی طرح ہر طرف سے ہجوم کریں بہر کیف خواہ کچھ ہو عالمگیر کی ہوشیاری سے تو ہمیں دارا شکوہ کی دیوانگی اور جنون دوستی پسند آتی ہے کہ وہاں تو تیغ ہوشیاری کشتگان حسرت کے خون سے رنگین ہے اور یہاں خود اپنے جسم کے رگہائے گردن سے خون کی نالیاں بہ رہی ہیں! شاید دارا شکوہ بھی عالمگیر جیسے ہوشیاروں کی ہوشیاری سے تنگ آگیا تھا۔ اسی لیے اس نے سرمد جیسے مجانین کی صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی۔

غرضکہ سرمد دارا شکوہ کی صحبت میں رہنے لگا اور اسے بھی سرمد سے کمال عقیدت تھی۔ اس زمانے میں عشق کی شورشس انگیزیاں کبھی کبھی اُسے باہر نکلنے پر مجبور کرتیں۔ لیکن چونکہ معلوم ہو چکا تہا کہ آخری امتحان گاہ یہی ہے۔ اسیلئے شاہجہاں آباد سے نکل نہیں سکتا تھا۔ یہاں تک کہ شاہجہاں کی علالت اور دارا شکوہ کی نیابت نے عالمگیری ارادوں کے ظہور کا سامان کر دیا اور ایک عرصہ کی شورشس و خونریزی کے بعد ۱۰۶۹ھ میں عالمگیر اورنگ نشین حکومت ہوا۔ یہ زمانہ دارا شکوہ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کیلیے خود دارا شکوہ سے کم مصیبت انگیز نہ تھا بہت سے لوگ تو دارا شکوہ کے ساتھ نکل گئے۔ اور جو رہ گئے اُنھوں نے اپنے آپ کو کشتی طوفان میں پایا۔ لیکن اس رہن بیخبری کو اپنے استغراق میں اس کی فرصت کہاں ملتی تہی کہ دنیا کو نظر اٹہا کے دیکھے اور اگر دیکھتا بھی تو وہاں سے

کیونکر ہلکتا۔ کیونکہ باایں ہمہ بے خبری اس سے بے خبر نہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے عشق کی ابتدائی منزلیں تھیں۔ آخری منزل طے کرنی باقی ہے اور وہ ابھی پیش آنے والی ہے۔ ؎

بیکدو زخم کہ خوردن زعشق امن مباش کہ در کمیں گہ ابرو کمانکش است ہنوز

سرمد کی شہادت کے اسباب تذکرہ نویسوں نے مختلف بتلائے ہیں

تذکرۃ الخیال میں ہے کہ سرمد کی اس رباعی پر جبہ پوشان شرع کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے اسے کفر قرار دیا کہ معراج جسمانی سے انکار لازم آتا ہے ؎

ہر کس کہ سر حقیقتش باور شد او پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر فلک شد احمدؐ سرمد گوید فلک بہ احمدؐ در شد

مگر اس ترک ساد کو فقیہانہ جنگ وجدل سے کیا سروکار تھا۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ یہ کور بصر کیا شور وغوغا کر رہے ہیں؟ وہ تو اس عالم میں تھا جہاں ان اقرار وانکار کی بحثوں کی آواز بھی نہیں پہنچ سکتی۔

در بحبوبہائے طور عشق حکمہا کم ست عقل را با مصلحت اندیشئ مجنون چہ کار

لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سرمد کا سب سے بڑا جرم دارا شکوہ کی معیت تھی۔ اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پالٹیکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹکل اسباب سے ہوئی ہیں انہیں مذہب کی چادر اُڑھا کر چھپایا گیا ہے۔ جب اور کوئی بہانہ نہ ملا تو عریانی وبرہنگی کو کہ خلاف رسم شرع ہے بنیاد قرار دیا۔ اور مذکورہ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراج جسمانی کا منکر ہے۔ ملا قوی اس زمانے میں قاضی القضاۃ تھے۔ عالمگیر نے انہیں سرمد کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں۔ ملا صاحب نے کہا کہ باوجود کمال علم وفضل برہنہ ومکشوف العورہ رہنا کس عذر پر مبنی ہے؟ سرمد نے کہا

کیا کروں شیطان قوی ہے۔ اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی ؎

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل منست و من در طلبش دزدے عجبے برہنہ کردہ پست مرا

ملا صاحب برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات ہی تھی۔ کیونکہ اسلام کی توہین نہیں کی گئی۔ مگر خود اُنکے وجود اسلام عبارت کی سخت اہانت ہوئی۔ یعنی ان کا اسم سامی ابلیس لعین کا وصف قرار پایا بہرکیف انہوں نے عالمگیر سے آکر کہا کہ کفر کا کافی مواد ہاتھ آگیا ہے اور قلمدان کھولنا چاہا کہ علمائے ظاہر کی تیغ خون آشام اسی نیام میں رہتی ہے۔ لیکن عالمگیر کی عاقبت اندیشیوں نے صرف اس بہانے کو کافی نہ سمجھا وہ خوب سمجھتا تھا کہ سرمد کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ جس کا قتل ایک عامتہ الورود واقعہ سمجھا جائے گا۔ علم و فضل کے لحاظ سے کوئی اس کا ہمتا نہیں۔ اور رجوع خلایق کا یہ حال ہے کہ سارا شاہجہاں آباد اُسکا معتقد اور ہوا خواہ ہے اس لیے جب تک کوئی بہانہ قوی ہاتھ نہ آئے اس ارادے کو ملتوی رکھنا چاہیئے۔

اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصہ میں فقہا کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے اور ہزاروں حق پرستوں کا خون اُنکے فتوٰں کا دامنگیر ہے۔ اسلام کی تاریخ خواہ کہیں سے پڑھو مگر سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ بادشاہ جب خونریزی پر آتا تھا تو دارالافتا کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے صوفیہ اور ارباب باطن پر منحصر نہیں علمائے شریعت میں سے بھی جو نکتہ ہیں اسرار حقیقت کے قریب ہوئے فقہا کے ہاتھوں انہیں مصیبتیں اٹھانی پڑیں اور بالاخر سر دے کر نجات پائی سرمد بھی اسی تیغ کا شہید ہے ؎

چوں میروم نظیری خونین کفن بحشر خلقے فغاں کنند کہ ایں دادخواہ کیست

آخرالامر یہ قرار پایا کہ سرمد کو علما و فضلائے عصر کے مجمع میں طلب کیا

جائے، چنانچہ مجلس منعقد ہوئی اور سرمد کو بلایا گیا۔ سب سے پہلے خود عالمگیر مخاطب ہوا۔ اور پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ سرمد نے دارا شکوہ کو مژدۂ سلطنت دیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟ سرمد نے کہا ہاں اور وہ مژدہ درست نکلا کہ اُسے ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ علماء بندوں نے کہا کہ برہنگی شرع کے خلاف ہے اور اُسکے لیے صاحب عقل وتمیز کا کوئی عذر مسموع نہیں۔ اسکا جواب تو سرمد پہلے ہی دے چکا تھا

دزدے بجے برہنہ کردہ ست مرا

خلیفہ ابراہیم بدخشانی اواخر عہد عالمگیر میں ایک صاحب طریقت بزرگ گزرے ہیں جو ابتدائے جوانی میں سپاہی پیشہ تھے۔ اور فتح اللہ خاں کے ہاں کہ امرائے عالمگیری میں سے تھا نوکر ہوگئے تھے۔ اتفاقاً میر جلال الدین بدخشانی نامی ایک صاحب حال بزرگ کی ان پر نظر پڑ گئی اور اُنکو فیض پذیر دیکھکر اپنی تربیت میں لیلیا۔ رفتہ رفتہ خود بھی صاحب حال ہوگئے علم ظاہری کی تحصیل کا گو موقع نہ ملا۔ لیکن مذاق فطری کا یہ حال تھا کہ مثنوی معنوی کا دفتر ہفتم چار حصوں میں نظم کیا۔ جو درد وکیفیت سے لبریز ہے معزالدین جہاندار شاہ انکی خدمت میں کمال اعتقاد رکہتا تھا۔ اور ہندوستان ودکن میں ہزاروں اشخاص ان کے معتقد وحلقہ بگوش تھے۔

والہ داغستانی انہیں بزرگ سے روایت کرتا ہے کہ جب مجمع علماء میں سرمد کو لباس پہننے کے لیے کہا گیا اور مسموع نہوا تو بادشاہ نے علماء سے کہا کہ محض برہنگی وجہ قتل نہیں ہوسکتی۔ اس سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھے اور یہ اسلیے کہا کہ بادشاہ سن چکا تہا کہ سرمد کی عادات عجیبہ میں سے ایک یہ عادت بھی ہے کہ کلمہ طیبہ جب پڑھتا ہے تو لاالہ سے زیادہ نہیں کہتا۔ علماء نے سرمد سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب لاالہ پڑھا کہ جملہ نفی ہے اسپر

علما نے شور مچایا تو کہا "ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا اگر لا الٰہ کہوں گا تو جھوٹ ہوگا۔ اور جو دل میں نہو وہ زبان پر کیسے آئے علما نے کہا ایسا کہنا کفر صریح ہے اگر توبہ نکرے تو مستحق قتل ہے۔ یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمد اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر و ایمان کی بحثیں سنائی جائیں اور قتل وخون کے احکام سے مرعوب ہو۔ یہ کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہوکر سوچتے تھے کہ اسکی کرسی کتنی اونچی ہے اور وہ اس منارہ عشق پر تھا جہاں کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں اور جہاں کفر و ایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں۔

کشو ہے ہست کہ در وے رو داز کفر سخن ہمہ جا گفت وشنو بر سر ایمان ورد

اور سرمد نے تو اپنی اصلی حالت بے کم و کاست بیان کردی تھی **ایمان بالغیب** پر جو لوگ قانع نہیں ہوتے (اور اس عدم قناعت ہی کا نام تلاش حقیقت ہے) وہ اپنے اقرار کو مشاہدہ عینی سے استوار کرنا چاہتے ہیں اور شاہد حقیقت کی رونمائی نقد شہادت ہے جو ابھی سرمد کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس جس چیز کو دیکھا نہ تھا کیونکر کہتا کہ "ہے"! اس ملک کے جتنے رہروہیں سب ہی کو اس منزل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن سرمد کا جرم یہ تھا کہ وہ جس جام کو چھپکر پیتے ہیں سرمد نے علانیہ منہ سے لگایا اور درہ محتسب کا مستحق ٹھیرا۔

خرقہ پوشان ہمہ گرمست گزشتند گزشت قصہ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

اور نظر تعمق سے دیکھئے تو یہ اعلان ضروری تھا کیونکہ جب اس سفر کی آخری منزل شہادت تھی تو خواہ ناقہ کا رخ کسی طرف ہوتا دست کارفرما کا فرض تھا کہ اُسی طرف پھیر دے۔

منصور را کہ رخصت اظہار دادہ اند غیر از قصاص و محنت زنداں نبود شرط

غرضکہ جب سرمد نے توبہ نہ کی تو علما نے بلا تامل فتوائے قتل صادر کیا اور دوسرے دن قتلگاہ میں لے گئے بموجب بیان مراۃ الخیال یہ واقعہ ۱۰۷۲ھ میں ہوا کہ عالمگیر کی تخت نشینی کو تین سال سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا ؂

موہوم دوست شد ترسم کہ ابتلائے عشق یک انا الحق گوئے دیگر بر سر دار آورد

شاہ اسد اللہ نامی ایک مرد درویش و حق آگاہ روای ہیں کہ مجھے سرمد کی خدمت میں کمال خصوصیت حاصل تھی جب شورش و ہنگامہ شروع ہوا تو مجھسے نہ رہا گیا ایک دن موقع پا کر عرض کیا کہ "اگر اپنی وضع و حالت بدل دیں تو بندگان الٰہی کی منت و سماجت دیکھتے ہوئے بظاہر کوئی نقصان نہیں" یہ سنکر نظر اٹھائی اور اپنا یہ شعر پڑھ دیا ؂

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

جب سرمد کو شہادت گاہ لیچلے تو بیان کیا جاتا ہے کہ تمام شہر ٹوٹ پڑا تھا اور اسقدر ہجوم تھا کہ راہ چلنا دشوار ہو گیا تھا عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہیئے جہاں کا عام پسند تماشا خونریزی ہے۔ اور جہاں قربانی سے بڑھکر کوئی دلپسند کھیل نہیں۔ جب کوئی سر دادہ سر بکف بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دولہا کی سواری جا رہی ہے اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔ ؂

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست تو نیز بر سر بام آ۔ کہ خوش تماشائیست

مگر یہ عشق مجازی تھا کہ بر سر بام آنے کی خواہش کی گئی ورنہ سرمد کو تو سر اٹھانے کی بھی ضرورت نہوئی۔ جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو مسکرا کے نظر ملائی اور کہا "فدائے تو شوم۔ بیا بیا کہ بہر صورتے کہ می آئی۔ من ترا خوب مے شناسم"

صاحب مراۃ الخیال راوی ہے کہ اس جملے کے کہنے کے بعد یہ شعر پڑھا

اور مردانہ وار تلوار کے نیچے سر رکھکر جان دیدی ؎

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم	دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

صاحب مراۃ الخیال کو عالمگیر کی خوشامد سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ سرمد کی نعش خون آلود پر اشک افشانی کرتا۔ لیکن یہ ستم ہے کہ اس سنگین دلی پر قانع ہو کر چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ خونریزی بھی عالمگیر کے دفتر مناقب و فضائل میں جگہ پائے حالانکہ اس دفتر میں تو پہلے ہی سے ہر صفحہ رنگین ہے اسکو بھی عشق ہی کی شیوہ گری سمجھئیے کہ یہاں کی قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلود ہوتے ہیں وہ مجرم خونی ہونے کی جگہ تحسین و ثواب کا صلہ مانگتے ہیں گویا میدان عشق بھی قربان گاہ منا ہے کہ جس قدر خون بہتا ہے عین ثواب ہے۔

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروز عید قرباں	وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمد کی جہاں قبر سمجھی جاتی ہے یہ اس کا مدفن نہیں صرف مشہد ہے لیکن والہ داغستانی نے تصریح کردی ہے کہ "درجنب مسجد جامع گردن اورا زدند۔ ودرہماں جا دفن کردند" یہ مقام موجودہ مقام مزار کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ پھر لکھتے ہیں کہ "راقم حروف بزیارت مزار وے مکرر مشرف شدہ ام درچہار فصل سبزہ از تربتش کم نمی شود۔ والحق فیض عجیبے در زیارت آں منصور ثانی ہست" والہ داغستانی عہد محمد شاہی میں تھا اور اُسکے تذکرے کا سال تصنیف ۱۱۶۱ھ ہے لیکن آج بھی مشہد سرمد زیارت گاہ عوام و خواص ہے اور ہمیشہ فاتحہ کے ہاتھ اسکے آگے رو بآسمان رہتے ہیں ؎

برسر تربت چون گزری ہمت خواہ	کہ زیارت گہ رنداں جہاں خواہد بود

خلیفہ ابن الراسم جنکے حالات اوپر گزر چکے ہیں راوی ہیں کہ سرمد نے زندگی میں کلمہ طیبہ لا الہ سے زیادہ نہیں پڑھا لیکن جب شہادت پائی تو لوگوں نے سنا

کہ سرکٹنے سے تین بار الا اللہ کی صدا بلند ہوئی اسکے علاوہ والہ داغستانی
لکھتے ہیں کہ ایک ثقہ جماعت سے سنا گیا ہے کہ سرمد کا سر مقتول کلمہ طیبہ پڑھتا
رہا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ دیر مصروف حمد الہی ہی رہا۔ موجودہ زمانے میں ایسی
روایتوں پر لوگ بمشکل یقین لائیں گے اور سوانح نگار کا فرض ہے کہ خوش اعتقادی
کی روایات اور تاریخ کو الگ الگ رکھے لیکن ہمیں تو یہ بیان پڑھکر کچھ تعجب
نہوا۔ کیونکہ اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں ہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں
سے بھی محروم ہو جانا چاہیے؟ ہم نے بہار میں شگفتہ و شاداب پھولوں اور
خزاں میں افسردہ اور خشک شاخوں کو باتیں کرتے دیکھا ہے۔ پھر اگر ایک شہید
عشق کے سر مقتول کے لب ہلتے نظر آئیں تو کیوں تعجب ہو؟ ممکن ہے کہ سرمد کے
بیجان سر سے آواز نہ نکلی ہو مگر ارباب بصیرت نے اسکی زبان حال کو تو ضرور
متکلم دیکھا ہوگا اور ڈھائی سو برس سے زیادہ گزر گئے ہمارے کانوں میں تو
اب تک مشہد سرمد سے صدا آرہی ہے کہ ؎

کس چہ داند قدر مرد نہارے عشق منت ایں مرگ بجان من ست

عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشیں ہوا۔ اور تین سال کے بعد سرمد کی شہادت کا
واقعہ پیش آیا۔ اسکے بعد ایک قرن سے زیادہ عرصے تک حکومت کی اکثر
لوگوں کا خیال ہے کہ

خونے کہ عشق ریزد ہرگز ہدر نباشد

یہ سرمد کے خون ہی کی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالمگیر کو کبھی راحت
واطمینان کے دن نصیب نہوے۔ یہانتک کہ پیغام اجل بھی آیا تو عالم غربت و
پریشانی میں مگر سوانح نویس کے قلم سے ایسے جملے نہیں نکل سکتے۔ ہمارے
لیے تو یہی بہتر ہے کہ ہو سکے تو عالمگیر کو بھی اس معاملہ میں معذور سمجھیں۔ تاریخ

قیاس و ظنون اور شخصی آرا کے پریشان مجموعوں کا نام ہے۔ آج چند میلوں کے فاصلہ پر ایک حادثہ گزرتا ہے تو اخباروں کے دو نامہ نگار متفق البیان نہیں ہوتے کس کو معلوم ہے کہ اسوقت کی اصلی حالت کیا تھی۔ اور عالمگیر کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا! پھر یہ بھی ہے کہ خون رفتگانِ عشق جب اپنے قاتلوں سے گلہ مند جفا نہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ انکی شکایت سے قلم آلودہ ہوں جب سرمد نے جلاد سے کہا کہ "تو بہر صورتے کہ مے آئی من ترا خوب مے شناسم" تو اسے عالمگیر اور عالمگیری علما سے کیا شکایت ہوگی! بات یہ ہے کہ دیارِ محبت میں انتقام و دعوے کی شنوائی نہیں۔ اور عشق کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھکر کوئی شئے حرام نہیں۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لیکر آئے تو سر جھکا دیجئے اور ہوسکے تو اسکے ہاتھوں کو بوسہ دیجئے۔

شد ست سینۂ ظہوری پر از محبتِ یار — برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

سرمد کے کلام کا ایک صحیح اور قلمی نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے مگر اسوقت پیش نظر نہیں۔ چند سطروں کا ارادہ تھا مگر کئی صفحے ہوگئے۔ اور عشق کی حکایت کب ختم ہونے والی ہے اسلیے چاہتا ہوں کہ روحِ سرمد پر دست فاتحہ اٹھاکر خاموش ہوجاؤں۔ آیندہ کبھی موقع ملا تو سرمد کا کلام پیش کروں گا افسوس ہے کہ یہ داستان مختصر نہوسکی۔ مگر شہیدانِ محبت کی یاد میں جتنی دیر افسردہ رہ سکیے بہتر ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم — چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

ابو الکلام آزاد دہلوی

تحفہ

دُرِ بے بہا - آئینہ باصفا

کی نسبت

ایڈیٹر نظام المشائخ کے الفاظ

یہ کتاب مولانا حکیم محمد علی میرزا بیگ صاحب سول شاہی نے مذہبی تحقیقات کے طور پر لکھی ہے مذہب اسلام پر جو آریوں وغیرہ کی طرف سے حملے اور اعتراض کئے جاتے ہیں ان کے اسمیں خوب مدلل جواب دیے گئے ہیں اور اسلام کی صداقت اور برتری کو عمدگی سے ثابت کیا گیا ہے۔ پیرایہ نہایت دلچسپ اور صوفیانہ حجم ۸۴ صفحے تقطیع $\frac{20}{26}$ قیمت ۸ آٹھ آنہ۔ علاوہ محصول

تحفہ

درد دل

اسلام اور فلسفہ زندگی کے بیش بہا نکات، مصنفہ قاری سرفراز حسین صاحب عزمی (سیاح جاپان) اس کتاب کا ایک حصہ مسٹر جی۔ ای ڈاڈ سابق کمشنر گورکھپور نے خاص اپنے شوق سے ترجمہ کرکے امریکہ کے مشہور میٹافیزیکل میگزین میں چھپوایا تھا ضخامت ۳۲ صفحے قیمت صرف دو آنے ۲ر علاوہ محصول ڈاک

تحفہ

طلب صادق

شہزادہ سلیم کی فلسفیانہ جستجوئے الوہیت اور منازل دنیا کا گوناگوں تجربہ، برنگ ناول مضمون، لکھائی، چھپائی۔ کاغذ سب عمدہ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

المشتہر

مینجر نظام المشائخ و درویش پریس ایجنسی - دہلی

آئندہ کیا کیا انقلاب آنے والے ہیں

اگر آپ کو یہ معلوم کرنے کا شوق ہو کہ آئندہ کیا کیا انقلاب آنے والے ہیں تو حکیم جاماسپ کی نایاب کتاب **جاماسپ نامہ** کا ترجمہ منگا کر دیکھیے جو **ملا محمد الواحدی** اڈیٹر نظام المشائخ نے نہایت فصیح اور سلیس اردو میں کیا ہے اپنے وقت سے لیکر آجتک کی بابت حکیم جاماسپ نے جتنی جتنی پیشین گوئیاں کی تھیں۔ وہ سب ہو بہو پوری اتریں مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام۔ سکندر رومی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم۔ مولی علیؓ امام حسن علیہ السلام امام حسین معرکہ کربلا۔ امیر تیمور۔ ہندوستان میں مغلوں کا عروج و زوال وغیرہ کہ جاماسپنامہ ان تمام کا ذکر ہے حکیم جاماسپ زرتشت بانی مذہب آتش پرستی کا خلیفہ اعظم اور شاہ گشتاسپ کا وزیر تھا جس کے زمانہ کو اب اندازاً پانچہزار برس گزر گئے **جاماسپ نامہ** کا ترجمہ ۳ر کے ٹکٹ بھیجکر یا بذریعہ ویلیو پی ایبل طلب کیا جاسکتا ہے۔

المشتہر

مینجر نظام المشائخ و درویش پریس ایجنسی دہلی